الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ

ہم پرورشِ لوح وقلم کرتے رہیں گے ❖ جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

دار القلم کا علمی وتحقیقی ترجمان

ماہنامہ القلم

برقی مجلہ

محرم الحرام ۱۴۴۵ھ

اگست ۲۰۲۳ء

زیر سرپرستی

حضرت الاستاذ مفتی عبد اللہ معروفی صاحب دامت برکاتہم

صدر شعبۂ تخصص فی الحدیث دار العلوم دیوبند

مجلس ادارت ومشاورت

محمد محسن قاسمی

محمد زید معروفی

محمد اسعد نعمانی

اسماعیل محسن قاسمی

منتظمین دار القلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس شمارے میں

اداریہ	سخن ہائے گفتنی	محمد محسن قاسمی	۳
مباحثِ حدیثیہ	تخریج حدیث کے مراحل............	محمد زید معروفی........	۶
تحقیقاتِ اسلاف	مولانا قاسم نانوتوی اور علمِ کلام........	اسماعیل محسن قاسمی ..	۱۰
//	الانتباہات المفیدۃ؛ تعارف اور مطالعہ ..	محمد اسعد نعمانی	۱۹
اوراقِ تاریخ	سو عظیم شخصیات: ابو بکر صدیق	حماد منصوری	۲۳
نظر و فکر	مغربی تہذیب کی دو فکر	محمد حذیفہ نوری	۲۹
ہونہاروں کے قلم سے	علم کیا ہے؟	محمد سفیان احمد، کریم گنج	۳۱
دار القلم کی سرگرمیاں	دار القلم اور رسالہ "القلم" کا فسانہ	محمد محسن قاسمی	۳۵
دریچۂ ریختہ	پس منظر	محمد محسن قاسمی	۴۰
کلامِ شاعر	سِوا خدا سب اُن کا ہے، اور خدا میرا...	اکبر آلہ آبادی	۴۱
//	جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے	علامہ اقبال	۴۲
//	قصیدہ اک نیا پڑھتا ہوں میں نعتِ محمد کا	امیر مینائی	۴۳
دار القلم کی پیش کش	اردو و فارسی لغت کی کتابیں	ادارہ	۴۴

تحقیقاتِ اسلاف

قسطِ اول

الانتباہات المفیدۃ؛ تعارف اور مطالعہ

بقلم: محمد اسعد نعمانی

فاضل: دار العلوم دیوبند

عیسائیت روزِ اول ہی سے اسلام کی بڑی حریف قوت رہی ہے۔ گزرتے ایام کے ساتھ عالم میں اسلام کا غلبہ، اس کے ساتھ عیسائیت کی شکست، بیت المقدس کا ہاتھ سے نکلنا، دن بہ دن اس کی سلطنت کا دائرہ محدود سے محدود تر ہونا؛ یہ وہ چیزیں تھیں جن کی وجہ سے وہ ہمیشہ مسلمانوں سے بر سرِ پیکار رہی۔ مگر ہر موقعے پر اسے شکست و ریخت سے دوچار ہونا پڑا اور عالمِ اسلام کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ یورپ کے بہت سے خطوں پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ یہ بات اس کو کب گوارا ہو سکتی تھی۔ لیکن مسلمانوں کی زبردست قوت کے سامنے اسے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔

دسویں صدی عیسوی کے بعد عالمِ عیسائیت کو احساس ہوا کہ مسلمانوں کی زبردست فتح اور ناقابل تسخیر قوت کا راز عسکری قوت سے زیادہ مذہبی جوش و جذبے اور تمنائے حصول شہادت وجنت میں پوشیدہ ہے؛ چنانچہ مسیحیت کے رہنماؤں نے اس احساس کے تحت صلیب کے نام پر اپنی قوم میں مذہبی جوش و جنون پیدا کرنا شروع کیا اور گیارہویں صدی سے اسلام کے مقابلے میں صلیبی جنگوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا، جو کئی صدیوں پر محیط رہا۔ ان جنگوں کے پیچھے دیگر مقاصد کے ساتھ ساتھ ارضِ مقدس پر قبضہ اور اسلام کو شکست دینا ان کا بڑا ہدف تھا؛ مگر ان جنگوں میں بھی اسلام کے جاں بازوں نے ان کو شکستِ فاش دی اور ارضِ مقدس ان کے ہاتھ جانے نہ دیا۔

جب کفر کو صلیبی جنگوں میں بھی شکست اور ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا تو اس چیز نے ان کو ایک بار پھر سوچنے پر مجبور کر دیا اور وہ دوبارہ جس نتیجے پر پہنچے وہ تیر بہدف تھا۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی قوت کا اصل راز ان کی ایمانی قوت، عقیدے کی پختگی اور روحانی تعلق ہے۔ اپنے دین پر پکا ایمان، اور بلند اخلاق و معنوی صفات، جو ان کے مذہب نے ان کو عطا کی ہیں؛ لہذا جب تک یہ چیزیں ان میں بر قرار رہیں گی، اس وقت تک وہ اپنے مدِّمقابل پر غالب رہیں گے۔ ان کو کسی حال میں شکست نہیں دیا جاسکتا۔ بقول ان کے: ”اگر تم چاہتے ہو کہ مسلمانوں کو شکست دو تو صرف اسلحے کی جنگ پر اکتفاء نہ کرنا؛ کیونکہ اس جنگ میں تم ان کے سامنے ہر دفعہ شکست ہی کھاؤ گے۔ تمھیں ان کے عقیدے کے خلاف لڑنا ہوگا؛ کیونکہ ان کی فاتحانہ قوت کا راز ان کے عقیدے میں مضمر ہے۔“ چنانچہ ان کو عقیدہ اور فکر کے اعتبار سے کمزور کرنے کے لیے ان کے خلاف فکری یلغار اور نظریاتی جنگ شروع کی گئی۔

اس جنگ میں مسلمانوں کے ظاہری وجود کو نشانہ نہیں بنایا گیا؛ بلکہ ان کے دین و عقیدہ، سوچ و فکر اور معاشرت و اخلاق کو ہدف بنا کر ان پر کاری ضرب لگائی گئی۔ اس نظریاتی جنگ میں فکری نوعیت کے وسائل کو بروئے کار لایا گیا؛ جیسے استاد، کتاب، درسگاہ، اسکول، کالج، علمی تحقیقات کتب خانے، اخبارات ورسائل، علاج معالجے کے ادارے، میڈیا، نشر واشاعت مثلا: ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما گھر، انٹرنیٹ، سیٹلائیٹ، فلمی بنانے والی کمپنیاں، سیاسی شخصیات اور سیاسی جماعتیں، سیاسی لٹریچر وغیرہ۔ یہ تمام وہ وسائل ہیں جو انسان کی سوچ و فکر اور نظریہ کو متاثر کرتے اور قوموں کے نظریاتی رخ کو بدلتے ہیں۔ آج ہزاروں مغربی ادارے اس میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس فکری لڑائی کے لیے انہوں نے یورپ کے کلیساؤں اور تعلیمی، سیاسی اور سفارتی مراکز میں اسلام، اسلامی فکر اور اسلامی تمدن سیکھنے اور ان پر تحقیق کرنے کے ادارے کھول دیے۔ یہ مراکز بعد میں استشراقی علوم اور عیسائیت کی تبلیغ کی شکل میں منظر عام پر آئے۔ ان مراکز میں منظّم طریقے سے اسلامی دنیا کی افکار اور تہذیب کی بناوٹ پر توجہ دی گئی اور مسلمانوں

کی نئی نسل میں اپنی فکر کی تاثیر منتقل کرنے کا کام شروع کیا گیا۔

اس نظریاتی انقلاب کو برپا کرنے کے نمایاں مراکز میں ہمارے سامنے تعلیمی ادارے مثلاً اسکول، کالجز، مغربی طرز پر مسلمان بچوں کی تربیت گاہیں، میڈیا کا موجودہ سیلاب وغیرہ ہے۔ ان تمام مراکز اور اداروں کی کوشش کے نتیجے میں ایک ایسی نسل تیار ہوگئی، جن کے نام تو اسلامی ہیں لیکن ان کے عقائد و نظریات، ان کے افکار و خیالات، ان کی زندگی کے تمام سیاسی، نظریاتی، اخلاقی، معاشرتی، عسکری، اقتصادی اور ادبی طور طریقے مغربی تصورات اور ترجیحات کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ بقولِ اکبرؔ الٰہ آبادی ؎

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر، باپ سے بیٹا نہ ملا

مذکورہ وسائل میں سب سے اہم چیز مغربی نصاب تعلیم ہے، جس کے ذریعے مسلمانوں کی نئی نسل کے اذہان کی ایسی کاشت کی کہ ان کے نزدیک اسلامی عقائد و مسلمات، سوچ و فکر قابلِ قبول ہی نہ رہے۔ مغربی نصاب میں ایسا فلسفہ پڑھایا گیا جس کے بعد ایک مسلمان اپنے عقائد کے تئیں شکوک و شبہات کا شکار ہو کر رہ جائے۔ ان کو اس نصاب کے ذریعے ایک ایسا عینک پہنایا گیا کہ وہ ہر چیز کو مغرب کی آنکھ سے دیکھے۔ ایسا ترازو دیا گیا کہ اس کے نزدیک صحیح غلط اور ظلم و انصاف کا معیار مغرب کا عطا کردہ قانون ہو۔ کوئی چیز ہزار غلط سہی، اگر وہ مغرب کے قانون کی روشنی میں صحیح ہے تو اس کی صحت پر کسی کلام کی گنجائش نہیں۔ اور اس کے برعکس وہ لاکھ صحیح کیوں نہ ہو، اگر مغرب سے اس کی تائید نہ ہو تو وہ نا قابلِ تسلیم ہے۔ اس منظم فکری یلغار کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اسلامی معاشرہ ایسے مذکورہ افراد سے بھر گیا۔

یہاں یہ ملحوظ رہے اس تفصیلی پس منظر کا ذکر اس لیے کیا گیا تا کہ یہ واضح ہو کہ یونانی فلسفے کے ذریعے اسلامی عقائد پر جو فکری یلغار ہوئی تھی، اس میں اور جدید فکری یلغار میں دو نمایاں فرق ہے:

پہلا: تو یہ کہ وہ کوئی منظم جنگ کا حصہ نہ تھی اور اِس کا پورا پس منظر آپ کے سامنے ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے وسائل بہت محدود تھے، اور اس فکری جنگ میں دشمن کے وسائل بہت غیر محدود ہیں جن کی طرف اوپر کی سطور میں اشارہ کیا گیا۔ ان دو اعتبارات سے عقائدِ اسلام پر کفر کا حملہ شدید تر ہے؛ ورنہ ان کا اصل فلسفہ سارا کا سارا قدیم فلسفے سے ہی ماخوذ و مستفاد ہے۔

اس جدید فکری یلغار سے نمٹنے کے لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ عقائد و احکاماتِ اسلام کے تئیں جو شکوک پیدا کیے گئے ہیں اور شبہات کے جو کانٹے بوئے گئے ہیں، ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ ایک ایک کرکے ان کا جواب دیا جائے؛ اس کے لیے ہمارے اسلاف اور متکلمین نے فنِ "علم کلام" کے عنوان سے اتنی خدمات کی ہیں کہ ان کے ذریعے علمی طور پر اس کا مقابلہ آسان تھا۔ اور اس میں ایسے اصول بیان کر دیے ہیں کہ ان سے ایک ایک جزئی کا جواب دیا جاسکتا تھا۔ اس کے لیے کسی نئی تصنیف کی ضرورت نہ تھی؛ لیکن مسئلہ ان اصول و کلیات کی ان جزئیات پر تطبیق کا تھا، جو علمِ کلام سے دوری کے سبب ہر کسی کے لیے آسان نہ تھا۔ اس حوالے سے تطبیقی نوعیت کے کام کی ضرورت تھی، اس کے لیے حکیم الامت مجدد الملت، امام المتکلمین حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے موزوں شخصیت اور کون ہو سکتی تھی، جس کا بین ثبوت آپ کی تمام تصانیف اور مواعظ ہیں، جن میں جدید شبہات کا اتنا کچھ حل آپ نے پیش فرمادیا ہے کہ شاید ہی اتنا کسی اور کے حصے میں آئے۔ چنانچہ آپ نے اس ضرورت کو محسوس فرما کر باقاعدہ اس موضوع پر "الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ" جیسی بے نظیر کتاب تصنیف فرمائی اور ایسے اصول و کلیات وضع فرمائے جن کی روشنی میں ہر شخص بآسانی شبہاتِ جدیدہ کا جواب دے سکتا ہے۔ ان سطور میں اسی تصنیف کا تعارف اور مطالعہ مقصود ہے۔

اصل کتاب کے تعارف اور مطالعہ سے پہلے چند عنوانات پر گفتگو ناگزیر ہے، جن پر خود حضرت مصنف قدس سرہ نے مقدمۂ کتاب میں گفتگو فرمائی ہے، ذیل میں وہ قدرے تفصیل و توضیح کے ساتھ پیش خدمت ہے:

[جاری ہے......]

تحقیقاتِ اسلاف

الانتباہات المفیدۃ؛ تعارف اور مطالعہ

قسطِ دوم

بقلم: محمد اسعد نعمانی

علم کلامِ جدید کیوں اور کیسے؟

تدوینِ جدید کی ضرورت

گزشتہ سطور سے یہ واضح ہے کہ مسیحیت کے رہنماؤں نے عالم اسلام پر تسلط حاصل کرنے اور ان کو ذہنی وفکری طور پر اپنا غلام بنانے کے لیے نظریاتی محاذ پر جو جنگ چھیڑی تھی، اس کے نتیجے میں اٹھارہویں صدی عیسوی میں تحریکِ استشراق نے زور پکڑنا شروع کیا اور اس تحریک کے نتیجے میں اسلام مخالف نظریات و افکار عالم اسلام میں تیزی سے پھیلنے لگے، مستشرقین کی طرف سے اسلام کے نام پر جو لٹریچر سامنے آیا اس میں تعلیماتِ اسلام کے تئیں شکوک و شبہات کے ایسے کانٹے بوئے گئے، کہ اس سے استفادہ کرنے والا خواہی نہ خواہی اپنے مذہب اور عقائد کے حوالے سے اپنا ایمان ویقین کھو بیٹھے یا کم از کم اس کے ایمان کی بنیاد متزلزل ہو کر رہ جائے۔ انہوں نے وجود باری، توحید و رسالت، ثبوت قرآن اور حجیت حدیث جیسے اسلام کے بنیادی عقائد کے تئیں بے بنیاد قسم کے شبہات پیدا کیے۔ یہ عسکری جنگ میں شکست خوردگی کے بعد، علمی میدان میں دنیائے عیسائیت کی طرف سے اسلام کو دعوتِ مبارزت اور مقابلے کا ایک چیلنج تھا۔

اسی کے ساتھ مستشرقین نے زہر کا جو پیالہ تیار کیا تھا، نئے علوم وفنون، (جن میں فلسفہ وجدید سائنس بھی شامل ہیں) میں سلیقے سے اس کی آمیزش کر دی گئی اور ایسا نصاب تعلیم تیار کیا گیا، جس کو پڑھنے والے طلبہ کے ذہنوں میں اسلامی عقائد اور تعلیمات کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ الغرض ایک تو عقائد وتعلیماتِ اسلام کے خلاف اعتراضات

اور شبہات پیدا کیے گئے دوسرے ان شبہات کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے کے لیے ویسا ہی نصابِ تعلیم تیار اور نافذ کیا گیا جس میں فلسفہ جدیدہ کو خاص جگہ دی گئ؛ کیوں وہ اس مقصد کے حصول کے لیے بہترین معاون تھا۔

تدوینِ جدید کا بیڑہ اٹھانے والے دو گروہ

ان احوال میں عالم اسلام کے ہر خطے میں وہاں کے علماء و مفکرین اس کے مقابلے کے لیے کمربستہ ہو گئے، جس طرح یونانی فلسفے کی یورش کے جواب میں علماء اسلام نے میدان میں اتر کر ان کے شبہات کا منھ توڑ جواب دیا تھا، جس کے نتیجے میں علم کلام جیسا عظیم فن وجود میں آیا؛ بر صغیر میں جو حضرات اس کے لیے آگے آئے وہ بنیادی طور دو قسم کے تھے:

پہلا گروہ: سر سید، شبلی، حالی وغیرہ

ان کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ غیروں کی طرف سے اسلام پر جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں، ان کا رد اور نئے علوم و فنون کی راہ سے طلبہ کے ذہنوں میں جو شبہات پیدا ہو رہے ہیں، ان کا ازالہ قدیم علم کلام سے ممکن نہیں، اس لیے علم کلام جدید کی تدوین ناگزیر ہے، اور اس جدید علم کلام کے بنیادی اصول واہداف یہ ہوں گے:

(۲) اصولی اور جزوی تمام مسائل میں سلف کی اتباع کے مقابلہ میں رائے کی آزادی کی اہمیت مسلم امت کے ذہن میں بٹھانا۔ (امت کا رشتہ سلف سے کاٹنا)

(۲) مسلمانوں کے عقائد، خیالات اور افعال کی اصلاح مغرب کے وضع کردہ قوانینِ فطرت کے اصولوں سے مقرر کرنا۔ (مغرب کے پیدا کردہ شبہات کے جواب کے لیے مغرب ہی کو حاکم بنانا)

(۳) سائنسی اور فطری اصولوں کے بر خلاف پائے جانے والے مذہبی مسائل کی از سر نو تحقیق۔

(۴) متقدمین اہل اسلام کی جانب سے مذہبی مسائل میں کی گئی غلطیوں کی سائنسی اصولوں اور مغربی فلسفہ کے وضع کردہ فطری اصولوں کے مطابق تصحیح۔ (حیاتِ جاوید:۲۱۶)

(یعنی شریعتِ مغرب پر کوئی حرف آئے بغیر، جہاں تک ہو سکے شریعتِ اسلام اور متقدمین کی تغلیط و تاویل کر کے دونوں میں توافق پیدا کرنا تاکہ شبہات رفع ہوں)

ان اصول پر کچھ گفتگو سطورِ ذیل کے ضمن میں آرہی ہے، تفصیلی گفتگو کے لیے حضرت حکیم الامت کی اصلاح الخیال دیکھی جاسکتی ہے۔

دوسری جماعت: علماءراسخین و متکلمین

ان حضرات کے نزدیک ہر قسم کے اعتراضات کے جوابات اور تمام شبہات کے ازالے کے لیے علمِ کلام قدیم ہی کافی وافی تھی، کسی جدید علم کلام کی ضرورت نہ تھی۔ ہاں قدیم علمِ کلام کے اصول کو سمجھ کر ان کی عملی تطبیق اور ان کو صحیح طور پر برتنے کی ضرورت ہے۔

اس جماعت کے ترجمان الانتباہات المفیدۃ کے مصنف امام المتکلمین حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ان احوال میں دفاعِ اسلام کے لیے جدید علم کلام کی ضرورت پر اٹھنے والی آوازوں کے پیش نظر یہ کتاب تالیف فرمائی تھی، اس لیے "کلام جدید" کے مفہوم، اس کی ضرورت کی نوعیت اور اصل علم کلام کے تئیں اٹھائے جانے والے شبہات پر اصولی گفتگو ناگزیر تھی، چنانچہ کتاب کے آغاز سے پہلے، باقاعدہ وجہ تالیفِ رسالہ کے عنوان کے تحت اس پر مفصل گفتگو کی گئی ہے لیکن مصنف کے عام اسلوب کے مطابق یہ مکمل گفتگو دریا بکوزہ کے بمصداق بہت مختصر عبارت میں سمودی گئی ہے۔ ذیل میں توضیح اور ترتیب کے ساتھ یہ مکمل بحث پیش کی جاتی ہے:

تدوینِ جدید کا غلط مفہوم

مسلمانوں میں فکری و عقیدگی گمراہیوں کو دیکھ کر ان کی اصلاح کے لیے علم کلام جدید کی تدوین کی آوازیں اٹھ رہی تھیں، اس کی وجہ یہ بتائی جارہی تھی کہ قدیم علم کلام قدیم فلسفے کے

رد کے لیے مدون ہوا تھا، اب سائنس اور فلسفۂ جدید کی راہ سے اسلام کے خلاف اعتراضات اور شبہات پیدا کیے جارہے ہیں، ان کے جواب کے لیے قدیم علم کلام ناکافی ہے، اس لیے علم کلام جدید مدون ہونا چاہیے!

اس ضمن میں بنیادی طور پر دو باتیں نکل کر سامنے آئیں: (۱) موجودہ دور کے سارے شبہات نئے ہیں۔ (۲) قدیم علم کلام ان کے رد اور ازالے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔

کیا موجودہ سارے شبہات جدید ہیں؟

(۱) سب سے پہلے تو یہ بات درست نہیں کہ جدید فلسفہ سے پیدا ہونے والے شبہات اور ان کی جدید تحقیقات بالکل جدید ہیں، اور ان کا قدیم فلسفے سے کوئی تعلق نہیں؛ کیوں کہ ان میں سے اکثر قدیم فلاسفہ کے کلام میں (صراحتاً یا ضمناً) مذکور ہیں اور ان پر ہمارے متکلمین نے کلام بھی کیا ہے۔ ہاں یہ بات اس حد تک درست ہے کہ:

الف: بعض قدیم شبہات لوگوں کی زبانوں سے ختم ہو چکے تھے، اور اب ان کا تذکرہ تازہ ہو گیا ہے، جس سے وہ جدید معلوم ہوتے ہیں۔

ب: بعض شبہات ایسے ہیں کہ ان کے نام اور عنوانات (یا اسلوب اور رنگ) بدل دیے جانے کی وجہ سے وہ جدید معلوم ہوتے ہیں، حالاں کہ وہ دوسرے عنوانات کے ساتھ پہلے سے موجود ہیں۔ تو ان دو صورتوں میں نیا پن حقیقی نہیں، ظاہری اور اعتباری ہے۔ اور اکثر اسی قبیل سے ہیں۔

ج: ہاں کچھ شبہات واقعی نئے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعی کچھ جدید تحقیقات ایسی سامنے آئی ہیں، جن کی وجہ سے کچھ نئے شبہات پیدا ہو گئے ہیں، یہ شبہات حقیقت میں نئے ہیں عنوان اور معنون دونوں اعتبار سے، یعنی وہ شبہات بھی نئے ہیں اور ان کے عنوانات بھی نئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ دور کے سارے شبہات نئے نہیں، بل کہ اکثر پرانے ہیں، جن کو یا تو ایک مدت تک ان کا تذکرہ ختم ہونے کی وجہ سے، یا ان پر نیا عنوان اور لیبل چسپاں کر دینے

کی وجہ سے ، جدید کہہ دیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ باقی کچھ شبہات واقعی نئے ہیں جو جدید تحقیقات سے پیدا ہو گئے ہیں۔

کیا علم کلام ان کے لیے ناکافی ہے ؟

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ علم کلام قدیم ان شبہات کے حل کے لیے ناکافی ہے، تو یہ بات بھی غلط ہے؛ کیوں کہ:

۱- جب حقیقت میں وہ (اکثر) شبہات ہی قدیم ہیں، تو یہ کہنا کہ قدیم علم کلام ان کے لیے کافی نہیں، ظاہر ہے درست نہیں، کیوں وہ خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قدیم علم کلام قدیم شبہات کے لیے کافی تھے۔

۲- جن لوگوں کی علم کلام کے اصول و قواعد پر نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ اصول ایسے جامع اور کافی وافی ہیں کہ ہر زمانے کے، ہر طرح کے شبہات کے جوابات ان سے نکل آتے ہیں، اور ایسے آفاقی ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں ہر طرح کے فتنوں کا کامیاب مقابلہ ان ہی اصول و قواعد کلامیہ سے ہوا ہے، وجہ ظاہر ہے کہ ان اصول کی بنیاد کتاب و سنت ہے۔ پھر ان اصول کے ذریعے اِس کا مقابلہ کیوں ممکن نہ ہو جب کہ یہ انہی قدیم شبہات سے ماخوذ اور مستفاد ہے ؟!

تدوینِ علم کلام جدید کا صحیح تصور

مذکورہ تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ بات درست نہیں کہ علم کلام جدید کی اس معنی کر تدوین ہونی چاہیے کہ موجودہ شبہات مکمل جدید ہیں، اور علم کلام قدیم اس کے لیے بالکل ناکافی ہے، مگر چوں کہ بعض پر نئے عنوانات لگ گئے جو ان عنوانات کے ساتھ سابقہ کتب میں مذکور نہیں ہیں، اور ان شبہات میں بعض نئی جزئیات واقعی ایسی پیدا ہو گئی ہیں جن کے جوابات ان میں فرداً فرداً مذکور نہیں ہیں، (گو کہ اصولاً مذکور ہوں) اس لیے اس ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان نئی جزئیات کے علاحدہ علاحدہ جوابات تحریر کیے جائیں، کیوں کہ ہر شخص اصول کو

روشنی میں ہر ایک کا الگ الگ جواب لکھا جائے۔ پھر ان جزئیات کے جوابات لکھنے کے بعد ان جوابات پر غور کرنے سے (جدید شبہات کے حل کے لیے) کچھ ایسی کلیات اور اصول سامنے آئیں گے، جو قدیم اصولوں سے اس معنی کر مختلف ہوں گے کہ براہ راست جدید شبہات کو پیش نظر رکھ کر سامنے آئیں گے، پھر اس قسم کے دوسرے تمام جدید شبہات کو ان حاصل شدہ اصولوں سے بآسانی حل کیا جاسکے گا۔ ان حاصل شدہ اصولوں کو تفریعی اصول، اور اُن کو اصل الاصول کہا جاسکتا ہے، کہ یہ قدیم اصول ہی کی تفریعات ہیں۔ الغرض تدوین کی اس صورت میں دو کام کیے جائیں:

(۱) لوگوں سے شبہات کو جمع کر کے قدیم اصول کی روشنی میں ہر ہر شبہ کا جواب تحریر کیا جائے۔

(۲) ان تمام جزئیات کے جوابات کے ضمن میں جو اصول و کلیات حاصل ہوں، ان کو تحریر کیا جائے۔ یہ دونوں کام اصول پر نظر رکھنے والے علم کلام کے ماہرین کا ہے۔ پھر اس تدوین کے بعد ہر شخص آسانی کے ساتھ ان کو پڑھ کر اس جیسے دوسرے شبہات کو حل کرنے پر قادر ہو جائے گا۔

اصولی کام کا ایک طریقہ

یہاں ایک بات کی طرف قارئین کو توجہ دلانا دل چسپی سے خالی نہ ہو گا کہ یہ مصنف نے کام کرنے کے ایک اہم اصول کی طرف اشارہ فرمایا، جس کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی نے مقاصد تراجم بخاری کے حوالے سے گفتگو فرماتے ہوئے رسالہ الابواب والتراجم میں ذکر فرمایا ہے، دونوں حضرات کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ جزئیات کو لیا جائے اور ہر ہر جزئی پر گفتگو کی جائے، لیکن جزئیات غیر محدود ہیں، اور روز کوئی نئ جزئی سامنے آتی رہتی ہے، پھر ہر جزئی دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، اس لیے کب تک آدمی ایک ایک جزئی میں لگا رہے، کام کرنے کا ایک جامع طریقہ یہ ہے کہ جزئیات پر نظر کی جائے اور ان کو سامنے رکھ کر جو باتیں

ان میں قدر مشترک نظر آئیں، ان کو نوٹ کیا جائے، اور ان جزئیات کی بنیاد تلاش کی جائے، اور ان پر اصولی نوعیت کی گفتگو ہو، اور ان کی روشنی میں کچھ اصول طے کیے جائیں پھر یہ اور اس جیسی جتنی جزئیات سامنے آئیں گی، وہ اصول ان سب کے لیے کافی ہوں گے۔ مثلاً حضرت حکیم الامت کی کتاب اشرف الجواب شبہات اور ان کے جوابات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں مذکور شبہات اور ان کے جوابات کا اسی نظریے کے تحت مطالعہ کیا جائے اور جو باتیں ان میں قدر مشترک ہوں، کلی اور اصولی نوعیت کی ہوں ان کو اخذ کر کے اصول کے طور پر متعین کیا جائے، جن سے وہ تمام شبہات اور جیسے دیگر شبہات بآسانی حل کیے جاسکیں گے۔ حضرت مصنف نے اس دوسری صورت کے تحت اسی بات کو بیان کیا ہے اور فی الفور معتدبہ شبہات جمع نہ ہونے کی وجہ سے اسی کی مختصر کڑی اگلی صورت میں بیان فرمائی ہے، اور یہ کتاب اسی اختصار در اختصار کا نمونہ ہے۔(جو اگرچہ بہت کافی وافی ہے لیکن) مذکورہ طرز کا مکمل کام مصنف کی اصل منشا کے مطابق ابھی تک تشنہ تکمیل ہے۔

مختصر ترین صورت

اس عظیم کام کے لیے ایک تو طویل وقت اور محنت درکار تھی دوسرے شبہات کے جمع کرنے میں حضرت مصنف نے جن لوگوں سے تعاون کی درخواست کی تھی، انہوں نے بروقت ساتھ نہیں دیا۔ اس بناء پر اگر اس کا انتظار کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ سارا کچھ ہی رہ جائے، لہذا تمام شبہات کے جمع ہونے کا انتظار چھوڑ کر مصنف نے یہ فیصلہ کیا کہ جو شبہات اب تک کانوں میں پڑے ہیں یا نظر سے گزرے ہیں، سر دست صرف ان ہی کے جوابات طلبہ کے سامنے زبان سے بیان کر دیے جائیں، اور ان کو لکھ کر بھی شائع کیا جائے۔ اس طرح یہ کام کا آغاز ہو گا، پھر جوں جوں شبہات جمع ہوں ان کے جوابات تحریر کیے جائیں اور ان کو دوسرا تیسرا حصہ قرار دے دیا جائے۔ (مستفاد از: وجہ تالیف رسالہ)

علم کلام جدید پر محنت کی ضرورت

حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہ نے علم کلام جدید بالمعنی الصحیح کی خشت اول رکھی ہے، اور آپ کے ذہن میں تدوین کا جو خاکہ تھا، اس کا یہ ابتدائی حصہ ہے، اس طرح بقول حکیم مولانا مصطفی بجنوری صاحب "مصنف کو اس فن (جدید علم کلام) میں متقدمین کا درجہ حاصل ہے"۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"یہ راز ہے الانتباہات" کی عبارت کے سادہ اور بظاہر مشکل ہونے کا کہ وہ علم کلام جدید کی پہلی کتاب ہے اور مصنف مد ظلہم کو اس فن میں متقدمین کا رتبہ حاصل ہے۔ اگر اس میں عبارات آرائی اور پھر انشا پردازی کی طرف توجہ کی جاتی تو ادائے مطالب میں ضرور کوتاہی رہتی اور سب جانتے ہیں کہ ایجاد کسی چیز کی مشکل ہوتی ہے، پھر اس کو دوسرے لباس اور صورت میں لے آنا کوئی بات نہیں۔" (حل الانتباہات ص: ۱۰)

اب حضرت حکیم الامت نے جو بنیاد کھڑی کی ہے، بعد والوں کے ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو تمام و کمال تک پہنچائیں۔ بقول سیدی حضرت بحر العلوم کوئی بھی فن یک بیک کمال کو نہیں پہنچ جاتا، بل کہ بتدریج ارتقاء کے مراحل طے کرتا ہے، بعد والے اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر اس فن میں طبع آزمائی کرتے ہیں، کوئی اصل کتاب کی شرح لکھتا ہے، کوئی اس پر حاشیہ لگاتا ہے، کوئی اضافہ کرتا ہے، کوئی تلخیص کرتا ہے، کوئی ترتیب اور تہذیب کا کام کرتا ہے، اس ضمن میں ردو قدح بھی ہوتا ہے کتاب پر کتاب لکھی جاتی ہے، پھر متون تیار ہوتے ہیں اور پھر ان کی شروح و حواشی کا سلسلہ چلتا ہے، ان مراحل میں فن نکھرتا اور اوج کمال کو پہنچتا ہے۔ (جس کی واضح مثال علوم حد اور فقہ کی تاریخِ تدوین ہے۔)

اور اس مرحلے کے طے کرنے میں ایک بڑی معاون چیز یہ ہے کہ اس کتاب کو مرکزی اداروں کے نصاب تعلیم کا حصہ بنایا جائے، جیسا کہ پاکستان کے بعض بڑے اداروں نے اس کو اپنے نصاب میں شامل کیا ہے۔ کیوں کہ جب کوئی چیز نصاب کا حصہ بن جاتی ہے تو اس کی شرح و

تعلیق کی طرف لازمی طور زیادہ توجہ ہونے لگتی ہے۔ الغرض ضرورت یہ ہے کہ اس وقت باطل افکار اور نظریات کے مقابلے کے لیے علم کلام جدید پر اسی قسم کی محنت ہو اور علماء و فضلاء اس فن کو اپنے مطالعہ و تدریس، تصنیف و تالیف اور بحث و تحقیق کا موضوع بنائیں اور اس پر کسی نہ کسی ناحیے سے کام کریں، ان شاءاللہ یہ فن بھی نکھرے گا اور علمی و عملی فتنوں کے اس دور میں امت مسلمہ کے حق میں بڑی مفید خدمت ہوگی۔

****

شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات!

میرے مطب کے نزدیک ایک پرچون کی دکان تھی اس دکان کے مالک کا نام مختار تھا؛ لیکن چھوٹے بڑے سب انہیں "بڑے ابا" کہتے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ بڑے ابا بھنگی (جمعدار) سے لڑ رہے ہیں۔

بڑے ابا: "میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے، جھاڑو دینے کے بعد کچرہ ڈبے میں ڈال دیا کریں آپ ویسے ہی چھوڑ دیتے ہیں، اب دیکھیں ہوا سے سارا کچرہ پھیل گیا ہے۔"

میں نے بڑے ابا سے کہا کہ "ابا، آپ بھنگی سے بھی آپ آپ کرکے بات کر رہے تھے؟" بڑے ابا کے جواب نے وہ کام کیا جو ڈیل کارنیگی اور اخلاقیات کی کئی کتابوں نے نہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا "حکیم صاحب وہ بھنگی ہے، میں تو بھنگی نہیں ہوں۔"

(ہوتا یہ ہے کہ ہم بھنگی سے بات کرتے ہوئے خود بھنگی بن جاتے ہیں)

(حکیم جلیس احمد صدیقی)